R. N. 7686/67

Regd. No. A 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No.
Telegrams "ANJUMAN"

جلد ۲۱ - شمارہ ۱۴ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | علی گڑھ ۸ اپریل ۱۹۶۲ء

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

ویبسٹر ڈکشنری کا تیسرا بین الاقوامی ایڈیشن

میں ستمبر ۱۹۶۱ء سے امریکہ میں مقیم ہوں۔ اس عرصہ کا سب سے اہم علمی اور لسانی واقعہ ویبسٹر ڈکشنری کے تیسرے بین الاقوامی ایڈیشن کی اشاعت ہے۔ جس کی بعض تفصیلات قارئین "ہماری زبان" کی دلچسپی کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔

یہ انگریزی زبان کی امریکی لغت سب سے پہلے ۱۸۲۸ء میں شایع ہوئی تھی۔ اس کے مولف نوح ویبسٹر (۱۷۵۸-۱۸۴۳) کے انتقال کے بعد اس کی اشاعت کی ذمہ داری اسپرنگ فیلڈ کی مریم کمپنی کے سپرد کردی گئی۔ جہاں اس کی جاذبین وضع کی بڑی خوبصورت اور علمی وجاہت ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں شایع ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں "امریکن انگریزی" کی اس لغت کا تیسرا بین قومی ایڈیشن اشاعت پذیر ہوا جس کا وزن ساڑھے تیرہ پونڈ ہے اور جس میں چار لاکھ پچاس ہزار الفاظ شامل ہیں۔

اس تیسرے آشوب ایڈیشن نے اسکولوں، کالجوں، عدالتوں، سفارت خانوں اور گھروں میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس میں عوام کے الفاظ کو "فصیح گویان امریکہ" کی زبان میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اور "محاورہ عام" اور "محاورہ عوام" میں فرق نہیں کیا گیا۔ چنانچہ اس کی مخالفت میں اٹلانٹک منتھلی، نیویارک ٹائمس، واشنگٹن پوسٹ، سٹرڈے ریویو آف لٹریچر، لائف میگزین، امریکن بار ایسوسی ایشن جرنل اور دوسرے وقیع پرچوں میں مضامین کا ایک سلسلہ جاری ہے جسکی وجہ سے اس ڈکشنری کی تیسری اشاعت نے "قومی مباحثہ" کی شکل اختیار کرلی ہے۔

اس ڈکشنری کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر گوو (GOVE) نے اپنی مدافعت میں جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ زبان برابر بدلتی رہتی ہے، اس میں نئے الفاظ شامل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ الفاظ اب ہماری زبان کا جزو بن گئے ہیں اس لئے ان کے آگے "محاورہ عوام" لکھنا غیر ضروری ہے۔ دوسرے بول چال کی زبان ہی اصل زبان ہے اور صحت کا دار و مدار استعمال پر ہے اور استعمال کا تعلق محل سے ہے جو قطعی اضافی چیز ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہم نے لفظوں کے چلن پر ۱۹۳۴ء سے باقاعدہ ریسرچ کی ہے اور جو الفاظ و معانی ہم نے لکھے ہیں وہ اختراعی نہیں بلکہ روزمرہ میں اسی طرح استعمال ہوتے ہیں۔ معترضین یہ کہتے ہیں اصل مسئلہ یہ ہے کہ سند کس کی مانی جائے؟ اجلاف کی؟ یا اشراف کی؟ رندوں، لفنگوں اور گفتار بنانے والوں کی؟ یا محتاط اور ممتاز مصنفوں اور پروفیسروں کی؟ اگر ہر آدمی یہ کہنے لگے کہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" تو زبان میں تاراج کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور ــــ کارخانہ تمام خواہد شد۔

دوسرے ایڈیشن میں مناسب مقامات پر یہ لکھ دیا گیا تھا کہ "یہ محاورہ عوام ہے" "خواص اس طرح نہیں بولتے" "یہ جہلا کی زبان ہے" "اس کا ترک اولیٰ ہے"۔ تیسرے ایڈیشن میں یہ صراحت یا حد بندی، اہتمام اور خصوصیت کے ساتھ نہیں کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ہزاروں "سقیم" الفاظ مستند امریکی زبان کا سرمایہ بن گئے!
تیسرے ایڈیشن کی اشاعت کے فوراً بعد دوسرے ایڈیشن کی قیمت ۳۰ ڈالر کے بجائے ۱۰ ڈالر رہ گئی لیکن اس تنقید اور تنقیص کے بعد اس کی قیمت پھر ۴۰ ڈالر کے قریب پہنچ گئی۔

ڈاکٹر گوو (Gove) کی عمر ۶۰ برس ہے وہ ۱۹۴۶ء سے

میریم ولبسٹر ڈکشنری کے ادارتی اسٹاف میں کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں ہارورڈ سے ایم اے اور ۱۹۳۱ء میں کولمبیا سے پی ایچ ڈی کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جنگ عظیم اول کے بعد سے "امریکی" زبان میں زبردست تبدیلیاں ہوئی ہیں اور تحریر و تقریر کی زبان میں بہت کم فرق رہ گیا ہے۔ لغت کی تدوین کرنے والے کو اپنی طرف سے "شخصی" فیصلے صادر نہیں کرنا چاہئے کہ یہ لفظ فصیح ہے یا غیر فصیح۔ اس کو ایمانداری سے ان الفاظ اور معانی کو جمع کر دینا چاہئے جن کے فائل a سے z تک ہمارے پاس موجود ہیں۔ اور جن کے استعمال کی سند ہم نے لاکھوں کتابوں، رسالوں اور اخباروں سے برسوں کی جاں کاہی کے بعد فراہم کی ہے۔ تاہم جہاں ہم نے بہت ضروری سمجھا ہے وہاں فصیح اور غیر فصیح کی صراحت بھی کر دی ہے مثلاً IRREGARDLESS کے آگے لکھا ہے "معیاری نہیں" دوسرے ایڈیشن میں تھا: "غلط العوام۔ مزاحاً جائز ہے"۔

انگریزی کا ایک لفظ ہے: فائنل۔ اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے: "فائنل میچ" "فائنل امتحان" اس سے فعل بنایا ہے FINALIZE۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ کنیڈی صاحب نے بھی استعمال کر دیا تھا۔ اخباروں نے اداریے لکھے کہ یہ صریحاً غلط ہے اور اس کا استعمال روا نہیں۔ ڈاکٹر گوو کا خیال ہے کہ یہ قطعاً جائز ہے اور "میزبانِ امریکہ" کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ یہ لفظ سب سے پہلے اسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں ۱۹۱۸ء سے قبل استعمال ہوا اس کے بعد انگلستان آیا۔ وہاں سے امریکہ۔ سابق صدر آئزن ہاور نے بھی استعمال کیا ہے۔

یہاں کے اخباروں میں اس قسم کے الفاظ برابر استعمال ہوتے ہیں

(1) MARY WILL BABYSIT AT 6.

(۱) میری چھ بجے (کسی کے بچے کو (اس کی ماں کی غیر موجودگی میں) کھلائے گی۔

(2) BASHIR AHMAD WAS JETTED INTO NEWYORK

(۲) بشیر احمد بذریعہ جیٹ نیویارک لایا گیا۔

(3) THEY HONEYMOONED IN SPAIN

(۳) انھوں نے ہنی مون اسپین میں منایا

(4) THE CHILDREN SHOULD BE STORIED BEFORE THEY GO TO BED

(۴) سونے سے پہلے بچوں کو کہانیاں سنانا چاہئے

ڈاکٹر گوو نے بڑا (Capital) حرف صرف God (خدا) کے لئے استعمال کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ NEWYORK CITY (نیویارک شہر) بھی چھوٹے حروف سے لکھنا چاہئے اس لئے کہ یہاں نیویارک اسم نہیں صفت ہے۔

رموزِ اوقاف کا استعمال بھی کم ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ اس لغت میں رواجِ عام کی پیروی کی گئی ہے اور کامے وغیرہ صرف اسی جگہ استعمال ہوئے ہیں جہاں وہ از بس ضروری ہیں۔

ڈاکٹر گوو کے اسٹاف میں بہت سے آدمی ہیں جن کا بجز اس کے اور کوئی کام نہیں کہ وہ جدید مطبوعات، اخبارات، رسائل، جرائد، فہرستیں، انتظام سفر کی ایجنسیوں کے فولڈر ریڈیو اور ٹیلی وژن کو دیکھتے پڑھتے یا سنتے رہیں اور اس طرح اگلے ایڈیشن کی تیاری میں مصروف رہیں۔

سوویت یونین میں مشرقی مخطوطوں کا نایاب ذخیرہ

سوویٹ یونین کے ایک مشہور مستشرق پروفیسر یوسف براگنسکی نے جو مشرقی لسانیات کے ماہر ہیں تاس کے نمایندے کو بتلایا ہے کہ "سوویٹ یونین میں مشرقی مخطوطات کا نایاب ذخیرہ موجود ہے جس میں مصر کی ابتدائی تحریروں سے لے کر ۱۹ ویں صدی کے عرب مورخین تک کی تصنیفات شامل ہیں۔ صرف لینن گراڈ ہی میں مشرق کی پچاس زبانوں کے تقریباً ایک لاکھ قلمی نسخے موجود ہیں۔ ازبک سائنس اکاڈمی کے پاس بھی تقریباً اتنے ہی قلمی نسخے ہیں"۔

انھوں نے کہا کہ سوویٹ یونین میں قلمی نسخوں کی اشاعت کا کام گذشتہ چند برسوں میں بہت تیز ہو گیا ہے۔ یہ کتابیں اپنی اصلی زبانوں میں شائع ہو رہی ہیں اور بعض کے ساتھ روسی ترجمے بھی شامل کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں تقریباً دو سو اہم ادبی اور تاریخی نسخے حواشی کے ساتھ شائع کئے جا چکے ہیں۔ ان قلمی نسخوں سے سوویٹ علما کو صرف اس لئے دلچسپی ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان ہی کی مدد سے مشرقی قوموں کی مستند تاریخ مرتب کر سکیں اور دکھا سکیں کہ دنیا کے کلچر کے ارتقا میں ان قوموں نے کتنا نمایاں حصہ لیا ہے۔

ماسکو میں مشرقی زبانوں کے جو قلمی نسخے محفوظ ہیں ان میں سے بڑی ادبی کتابوں کی اشاعت کا کام شروع ہو چکا ہے اور اب تک بیس جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ فردوسی کا شاہنامہ حواشی اور تلمیحات کی تشریح کے ساتھ شائع کرنے کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ شاہنامہ کو ایک طرح سے ساتویں صدی کے ایران کی تاریخ کہنا چاہئے۔ اس سے پہلے اس کے جو ایڈیشن شائع ہوئے ہیں وہ سب پندرھویں صدی کے قلمی نسخوں پر مبنی ہیں لیکن سوویٹ مستشرقین نے جو نسخہ اشاعت کے لئے تیار کیا ہے۔ وہ اس سے پہلے کے پانچ قلمی نسخوں پر مبنی ہے جو قدیم ترین تصور کئے جاتے ہیں جو تیرھویں اور پندرھویں صدی کے درمیانی زمانے کے ہیں۔ ان میں سے تین نسخے لینن گراڈ میں محفوظ ہیں۔

رسائل عمر خیام کے ان رسالوں کا روسی ترجمہ بھی شائع ہوا ہے جو انھوں نے علم ریاضی اور فلسفے پر تصنیف کئے تھے۔

سوویٹ مستشرقین، جن کے پاس مشرقی اقوام کی ادبیات و تاریخ کا اتنا عظیم اور نادر ذخیرہ موجود ہے، وہ ماسکو میں مشرقیات کا ایک مرکزی ادارہ بھی قائم کر رہے ہیں تاکہ سوویٹ یونین کے مختلف علاقوں کے مستشرقین کے کاموں میں رابطہ قائم کیا جا سکے۔

ہماری زبان

۸ اپریل ۱۹۶۲ء

قومی وحدت اور ادیب

یکم اپریل کو ساہتیہ اکاڈمی کے انتظام میں ہندوستان کے ادیبوں کا جو اجتماع دہلی میں ہوا وہ اس لحاظ سے بہت اہم تھا کہ تمام ہندوستانی زبانوں کے نمایندوں نے اس میں شرکت کی اور "قومی وحدت اور ادیب" کے مسئلے پر مختلف خیالات کا اظہار کیا۔ ہندوستانی مزاج کی رنگا رنگی اور ادیبوں کی انفرادیت اس سے ظاہر ہوتی تھی مگر اس مسئلے پر خاصے اختلافات رونما ہوئے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے شروع میں ادیبوں کو خبردار کیا کہ ملک میں ایسے مسائل اٹھ رہے ہیں جن سے اس کی وحدت اور سالمیت کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ عام چناؤ میں ذات پات کے فرق کو جس طرح استعمال کیا گیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذات کا سوال اب ایک سماجی مرض ہو یا نہ ہو ایک سیاسی مرض ضرور ہو چلا ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ادیبوں کو توجہ دلائی کہ وہ ملک کی وحدت و سالمیت کی خاطر ہر ایسے خطرے کا مقابلہ کریں اور قوم کی ذہنی رہنمائی ایسے ادب کے ذریعے کریں جو انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا مظہر ہو۔ شری رام دھاری سنگھ دنکر نے مذہب کی تعلیم، قومیت کے فروغ، مشاہیر ہند کے افکار و اقدار، شمالی ہند اور جنوبی ہند کو قریب لانے کے لئے دونوں کی خصوصیات کی وضاحت، نیم وحشی قبائل کی زندگی، چھوت چھات اور ذات پات پر معلوماتی کتابوں کا ایک سلسلہ شایع کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ نیز انھوں نے ایسی کتابوں پر انعامات دینے کی تجویز پیش کی۔ جن سے قومی وحدت کا احساس مضبوط ہوتا ہو۔ انھوں نے ایک ہندوستانی زبان سے دوسری میں تراجم کے سلسلے کو بڑھانے کی پرزور حمایت کی اور کہا کم سے کم پانچ ہزار ایسے نوجوان تیار کرائے جائیں جو اس کام کو خوبی سے کر سکتے ہوں۔

سردار پانی کر نے وحدت (*Integration*) کے بجائے اتحاد (*Unity*) پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ وحدت کے خیال کو عام کرنے میں یہ خطرہ ہے کہ مختلف مذاہب کا دوران کے اثر سے مختلف تہذیبوں کے فروغ کو صدمہ پہنچے گا۔ ہندوستان مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبی اثرات کا ملک ہے۔ یہاں اتحاد کی کوشش کرنی چاہئے نہ کہ یکسانیت پیدا کرنے کی۔ انھوں نے یاد دلایا کہ جب پاسترناک نے ڈاکٹر ژواگو لکھا تو تمام دنیا میں اس لئے اسے سراہا گیا کہ ایک ادیب نے اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے اور ایک سماجی نظام سے اپنا اختلاف ظاہر کیا ہے۔ اگر ہم ادیبوں سے یہ کہیں کہ یہ لکھو وہ نہ لکھو تو اس طرح ہم روسی نظام کا اتباع کریں گے۔ ادیبوں پر کوئی پابندی نہیں عاید کرنی چاہئے۔ انھیں بالکل آزاد چھوڑ دینا چاہئے کہ وہ جو چاہیں لکھیں۔ ادیبوں کا کام اچھا ادب تخلیق کرنا ہے۔ قومی وحدت کا مقصد اگر اس سے پورا ہو تو بہت اچھا ہے اور اگر نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔

مباحثے میں خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر ملک راج آنند، پروفیسر راجن، پروفیسر نہار رنجن رے، کاکا کالیلکر، جوزف منڈیسری، آل احمد سرور، پروفیسر موہن سنگھ، سجاد ظہیر، ڈاکٹر چیٹیار اور متعدد ادیبوں نے حصہ لیا۔ عام طور پر یہ کہا گیا کہ ادیب قومی امور کے مسئلے سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ ہاں براہ راست اس مسئلے پر اظہار خیال کرنے کے بجائے تخلیقی طور پر اپنی تصانیف میں اسے پیش کرنا چاہئے۔ کچھ لوگوں نے سردار پانی کر کی تائید بھی کی مگر زیادہ تر نے ان سے اختلاف کیا۔ زیادہ تر قومی وحدت پر زور دیا گیا اور اسے جو خطرے ہیں ان کی نشاندہی کی گئی۔ اس طرح بحث ادیبوں کے رول پر کم ہوئی، قومی وحدت پر زیادہ۔ ڈاکٹر راجن نے سب سے پہلے صاف الفاظ میں کہا کہ ادیبوں کا اصل کام اچھا ادب تخلیق کرنا ہے، ہاں اس ادب کی تخلیق میں وہ سیاسی اور سماجی مسائل سے بے نیاز نہیں ہو سکتے مگر ان مسائل کا بیان اس طرح ہونا چاہئے کہ وقتی باتوں میں آفاقی کیفیت آ جائے۔ خواجہ غلام السیدین نے مذاہب کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کو عام کرنے پر زور دیا۔ جوزف منڈیسری نے ثانوی منزل تک قومی تعلیم کی اہمیت واضح کی۔ کیونکہ اس کے بغیر ادیبوں کے خیالات کے عام ہونے کے لئے مناسب فضا نہیں مل سکتی۔ ڈاکٹر آنند اور سجاد ظہیر نے کہا کہ مذہب کے نام پر آپس کے اختلافات کو بڑھانے والوں کی روک تھام کرنا چاہئے۔

پروفیسر ہمایوں کبیر نے آخر میں اظہار خیال کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ ادیبوں کو آزاد چھوڑ دینا چاہئے اور ریاست کو ان سے یہ مطالبہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ یہ لکھیں اور یہ نہ لکھیں۔ مجموعی طور پر انھوں نے سردار پانی کر کے خیالات کی تائید کی۔ اس بحث سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ قومی وحدت کے تصور کو عام کرنے پر اختلاف نہیں ہے نہ اس کی ضرورت سے کوئی انکار کرتا ہے۔ مگر ادیبوں کے رول پر خاصا اختلاف ہے۔ یہ اختلاف بجا نہیں مگر ادیبوں کو اپنے طور پر قومی وحدت کے خیالات کو عام تو کرنا ہے۔ موجودہ دور میں اچھا ادب پڑھنے والے بہت کم ہیں۔ ملک میں سطحی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ جاسوسی ناولوں اور سستی فلموں کی وجہ سے قدروں کی اتھل پتھل ہو رہی ہے۔ اخبار لوگوں کے ذہنوں پر الٹے سیدھے اثرات ڈالتے ہیں۔ اس لئے ادیب جو انسانیت کے ضمیر کے آئینہ دار، تہذیب کی قدروں کے علم بردار اور سماج کی ذہنی صحت کے ضامن ہیں، اس افراتفری سے آنکھیں بند کر کے زریں گنبد میں پناہ نہیں لے سکتے۔ وہ نہ تو ریاست کی مشین کا پرزہ بن کر حکم کے مطابق ادب تخلیق کر سکتے ہیں نہ ریاست کے وقار سے آنکھیں بند کر کے اپنی خیالی جنت میں پناہ لے سکتے ہیں۔ انھیں اپنے محبوب وطن، تہذیب اور انسانیت کی خدمت کرنا ہے اور اس کے لئے ایک طرف توانائی کے ادب کو اور توانا بنانے کے لئے آگہی کے ادب سے مدد لینی پڑے گی اور دوسری طرف انسان دوستی کے پرچار سے آگہی کو عشق کے آداب سکھانے پڑیں گے۔ ادیب کو کسی حکومت کا نہیں ہاں اپنی ریاست کا وفادار تو ہونا چاہئے۔ اگر وہ اپنے مرکز سے علیحدہ ہو گیا تو اس کا ادب خلا میں ہوگا۔ شجر سے پیوستہ رہ کر ہی بہار کی امید کی جا سکتی ہے۔

انجمن ترقی اردو راجستھان کی جانب سے عصرانہ

انجمن ترقی اردو راجستھان کی جانب سے ۲۷ اپریل ۶۲ء بوقت ۵ ½ بجے شام انجمن کے دفتر تسلیم منزل (جے پور) انجمن کے نائب صدر جناب میجر خان محمد برکت اللہ خان (ڈپٹی منسٹر راجستھان) کے اعزاز میں ایک شاندار عصرانہ دیا گیا جس میں انجمن مذکور کے جملہ اراکین کے علاوہ اردو دوست حضرات اور معززین شہر کی کثیر تعداد نے شرکت فرمائی۔ جہاں خصوصی کے علاوہ چند اصحاب کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

(۱) شری ہری بھاؤ اپادھیا۔ ایجوکیشن منسٹر راجستھان
(۲) شری رام کشور ویاس۔ سابق ہوم منسٹر راجستھان
(۳) خان بہادر الطاف احمد خیری
(۴) خان بہادر عبدالرشید خان سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی
(۵) سید احمد علی شاہ جعفری (۶) لاؤ بہادر ریٹائرڈ اوتار نراین بہادر
(۷) شری آنند نراین کول سشن جج (۸) صاحب زادہ خلیل احمد خان
(۹) خان بہادر عبدالوحید سابق پروفیسر میو کالج اجمیر
(۱۰) نواب عبدالباقی خان (۱۱) انسپکٹر جنرل جیل راجستھان
(۱۲) سپرنٹنڈنٹ سنٹرل جیل جے پور
(۱۳) سید بشیر الدین صاحب لائبریرین راجستھان یونیورسٹی جے پور
(۱۴) الحاج عبدالصمد میونسپل کونسلر
(۱۵) جناب محمد افتخار علی شمیم سپرنٹنڈنٹ گورنمنٹ پریس
(۱۶) جناب محمد غضنفر علی ایڈوکیٹ (۱۷) جناب منشی بہاری لال صاحب
(۱۸) جناب محمد وحید الدین ریٹائرڈ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولس
(۱۹) جناب سید لائق علی عسکری ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پولس
(۲۰) جناب استاد اجیا میاں جوہری وغیرہم

اول انجمن مذکور کے جنرل سکریٹری مولوی احترام الدین احمد شاغل نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ظاہر کیا کہ معزز مہمان (خان محمد برکت اللہ خان) ۱۹۵۶ء سے انجمن ہذا کے رکن رکین اور مخصوص معاونین میں رہے ہیں اور ۱۹۵۹ء سے انجمن ترقی اردو راجستھان کے نائب صدر ہیں۔ کل راجستھان اردو کنونشن جے پور منعقدہ ۶۰ء کے موقع پر ان کی ناقابل فراموش خدمات کا اظہار بھی کیا اور انجمن پر ان کی عنایات کا اعتراف کیا۔ اسی طرح شری رام کشور ویاس کی دلچسپیوں اور اردو سے ان کی ہمدردیوں اور انجمن کی امداد کا حال ظاہر کیا نیز ایجوکیشن منسٹر صاحب کی علمی و ادبی شخصیت اور ۱۹۵۲ء سے اُن کی انجمن ترقی اردو پر توجہ ذکر کرتے ہوئے حاضرین سے اردو کی ہر امکانی خدمت کی استدعا کی۔ اس کے بعد جگر ابیری۔ مونس جے پوری اور کول صاحب موصوف نے معزز مہمان کی نسبت اپنے تاثرات لفظاً ظاہر فرمائے۔ آخر میں مہمان موصوف (ڈپٹی منسٹر) نے حاضرین کو مخاطب کیا اور اردو کی پرورش کا ملکی و قومی اہمیت ادبی، تمدنی اور ثقافتی حیثیت سے ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جہاں تک راجستھان گورنمنٹ کا تعلق اردو زبان سے ہے وہ

اس کے ہر جائز مطالبے کو پورا کرے گی۔ بلاشک اب تک جس قدر حکم احکام جاری ہو چکے ہیں ان پر ماتحتوں کی جانب سے خاطر خواہ عمل نہیں ہوا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ نمایشی ہوں اور ماتحت اُن کو پس پشت ڈال دیں۔ ان پر عمل کرایا جائے اسی طرح ہر دیگر جائز مطالبہ پورا کیا جائے گا۔

موصوف کی تقریر کے بعد ۷ ½ بجے شام بخیر و خوبی تقریب ختم ہو

نامہ نگار

انجمن ترقی اردو شاخ کریم نگر کی اردو کانفرنس

اردو اخبارات ورسایل کی نمایش

انجمن ترقی اردو شاخ ضلع کریم نگر (اندھرا پردیش) کی جانب سے ضلع کے اردو مسائل کا جائزہ لینے کے لیے ۵ و ۶ مئی ۱۹۶۲ء کو کریم نگر میں ضلعی اردو کانفرنس منعقد کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں ابو المکارم غازی الدین کمال کریم نگری معتمد انجمن ترقی اردو شاخ ضلع کریم نگر (آندھرا پردیش) نے اردو اخبارات و رسائل کے مدیروں سے اپیل کی ہے کہ ۵ و ۶ مئی ۱۹۶۲ء کو منعقد ہونے والی کریم نگر ضلع کانفرنس کے موقع پر کل ہند اردو اخبارات و رسائل کی نمایش کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنا تازہ شمارہ ۲۰ اپریل ۱۹۶۲ء تک دفتر انجمن ترقی اردو شاخ ضلع کریم نگر (آندھرا پردیش) کے پتہ پر روانہ فرمائیں۔

مہاراشٹر اردو بک سیلرز اوارڈ

مہاراشٹر اردو بک سیلرز ایوارڈ کمیٹی نے پانچ افراد پر مشتمل ایک "سب کمیٹی" بنائی تھی تاکہ وہ انعامی مقابلہ میں آئی ہوئی کتابوں پر غور کر کے قابل انعام کتابوں کے بارے میں اپنی سفارشات پیش کرے۔ چنانچہ اس "سب کمیٹی" نے حسب ذیل اردو اور مراٹھی کتابوں کو ۱۹۶۱ء کے ظفری ایوارڈ کے لئے منتخب کیا:-

اردو

۱۔ میرزا مظہر جان جاناں	عبدالرزاق قریشی
۲۔ اردو غزل ولی تک	ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی
۳۔ دیوان میر	مرتبہ سردار جعفری
۴۔ یادیں	اختر الایمان

مراٹھی

اردو کاویہ چا پریچے (اردو شاعری کا تعارف) از سیتو مادھو راؤ

قارئین کو یاد ہوگا کہ کمیٹی نے گذشتہ سال دو اردو اور ایک مراٹھی کتاب پر انعام دیا تھا۔

شاہد علی خان جنرل سکریٹری

کوٹہ میں آل راجستھان مشاعرہ

کوٹہ ۱۰ مارچ کو بتقریب جوبلی ایک آل راجستھان مشاعرہ "بزم کمال" کوٹہ کی جانب سے منعقد ہوا جس کی صدارت حضرت جگر کیفی ٹونکی نے فرمائی۔ جس میں مقامی و بیرونی شعرا نے شرکت کی۔

مسٹر عبدالغفور

دانش فرازی

یہ لوگ

سوچتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کچھ بھی
مجھ سے کیا ایسی خطا آج ہوئی ہے اے دوست
انگلیاں اٹھتی ہیں، آنکھوں کا پُر اسرار سکوت
پیش خیمہ ہے کسی محشرِ رسوائی کا
دیکھنے والوں کا انداز یہی کہتا ہے
مہلتِ یک دو نفس ہی مل جائے
میرے گھر کے در و دیوار کی پھر خیر نہیں
میں نے آئینے میں ہر طرح سے صورت دیکھی
کسی گوشے سے نہ ابھرا کوئی مبہم سا نشان
جس کو میں فتنۂ خاموش کا غماز کہوں
میری آنکھوں کے عمق میں وہ چمک بھی تو نہیں
برق بن کر جو کسی خرمنِ ہستی پہ گرے
خونِ ناحق سے مرے ہاتھ کو رنگیں کر دے
سوچتا ہوں یہ مہذب سے خطا پوش سے لوگ
اپنے کردار کے داغوں کو چھپاتے کیوں ہیں
کاش وہ اپنے ہی تہ خانے میں لوٹیں اک دن
اور دیکھیں کہ وہاں کتنے ہی خونیں مقتل
اور دیکھیں کہ وہاں دار و رسن کتنے ہیں
کتنی خوں گشتہ تمناؤں کی فریادیں ہیں
کتنے روندے ہوئے جذبات کی رودادیں ہیں

سلام بن رزاق

صبحِ اُمید

پھر وہی رات وہی رات کا اندھیرا ہے
دور تک صبحِ ضیا بار کے آثار نہیں
ظلمتیں اس طرح منہ پھاڑے چلی آتی ہیں
جیسے افریقہ کے جنگلات کے بھوکے اژدہے
جان پڑتا ہے یہ انساں کو نگل جائیں گے
اور مٹا ڈالیں گے انساں کا ہستی سے وجود

کون کہتا ہے کہ انسان پہ اب ظلم نہیں
آج بھی سیکڑوں انسان بکا کرتے ہیں
آج بھی بکتی ہے آدم کے لہو کی ہر بوند
آج بھی مصر کے بازار لگا کرتے ہیں

آج بھی میری طرح کتنے ہزاروں انساں
خونِ دل پیتے ہیں اور پیاس بجھا لیتے ہیں
اپنے ہی خون سے کچھ شمعیں فروزاں کرکے
اپنے تاریک مقدر کو سجا لیتے ہیں

مجھ کو تسلیم کہ چھائی ہیں گھٹائیں ہر سو
دور تک صبحِ ضیا بار کے آثار نہیں
سیکڑوں اور بھی ہیں خانماں ویراں اے دل
تو اکیلا ہی شبِ تار سے دوچار نہیں

اس سیہ رات کا اتمام ابھی باقی ہے
یہ تو آغاز ہے انجام ابھی باقی ہے

غزل

ناصر زیدی

ترجمانِ غم وہ جہاں بن گئی — زندگی دکھ بھری داستاں بن گئی
پھر امیدوں کے گلشن مہکنے لگے — پھر مری زندگی کہکشاں بن گئی
ہیں انھیں دیکھنا ہی [illegible] — ہر نظر دھڑکنوں کی زباں بن گئی
آج ناصر یہ کس کے قدم آ گئے — رہگذارِ وفا کہکشاں بن گئی

طالب [illegible]پوری

خوں زخمِ جگر [illegible] — یہ پھول محبت کے مرجھا نہیں سکتے
آجاتے ہیں ایسے بھی محبت میں مقام — [illegible] ہم بھی بتا نہیں سکتے
دیکھے تو کوئی غیرتِ الفت کا یہ پہلو — روتا ہوں مگر پلکوں پہ اشک آ نہیں سکتے
ہم ڈھونڈ رہے ہیں انھیں [illegible] طالب — گم ہو کے جہاں آپ کو بھی پا نہیں سکتے

افتخار احمد فہمی ندوی

مری زندگی کا حاصل یہی سوز و سازِ غم — غمِ زیست بھی مسلسل تری یاد بھی مسلسل
ہوا انھیں کو زیب [illegible] — تجھے گر ہے شوقِ منزل اسی راہ پر چلا چل
وہ زندگی کی ظلمت بڑھی حد سے جب گزر گئی — تو لہو سے اپنے دل کے ہم جلا گئے مشعل

شاہین غازی پوری

نوحۂ گل کے پیام بر تھے ہم — نورِ نغمہ سے رنگ سے کھیلے
کون وحشی کا ہم نوا بن کر — بارشِ خشت و سنگ سے کھیلے
ہم بھی شاہیں کتنے سرکش ہیں — ایک شیشہ تھے سنگ سے کھیلے

میر حسین علی اختر

یوں زندگی کو غم میں ڈبوتے رہے ہیں ہم — ہنس ہنس کے اپنے حال پہ روتے رہے ہیں ہم
دیکھی گئی نہ ہم سے تو بے رنگیِ حیات — نشتر سا اپنے دل میں چبھوتے رہے ہیں ہم
واقف کہاں تھے رسم و رہِ عشق سے مگر — خود کو ترے خیال میں کھوتے رہے ہیں ہم
تردامنی کا فیض ہے اختر کہ عمر بھر — داغِ گناہ اشک سے دھوتے رہے ہیں ہم

سید مجیب الرحمٰن

اقبال کا فلسفۂ خودی اور اُپنیشد

یہ بات بہت ہمت افزا ہے کہ آج اردو زبان کے دانش ور اپنے روایتی انداز میں اپنے انفرادی مسائل کو حل کرنے میں قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے مسائل سے ان کا رشتہ جوڑنے لگے ہیں اور اس طرح وہ قومی زندگی کے ارتعاش کو محسوس کرنے میں صف اول میں شریک ہیں۔ مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان کے مخصوص مسائل کی تصویر کو اور بھی وسیع پس منظر کے ساتھ پیش کیا جائے۔

ادیب، شاعر یا فن کار کے مسائل میں زندگی کے فلسفے کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے۔ پروفیسر ہمایوں کبیر کہتے ہیں کہ "فلسفہ کے ذمے زندگی کے عقائد کو جانچنے کا کام ہے۔ فلسفہ تہذیب کی متعینہ بنیادوں کی تنقید ہے۔" اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ تہذیب کی ترقی کے لئے فلسفہ کی ترقی پر بھی دھیان دیا جائے۔

فلسفے خواہ کتنے ہی مکتب خیال ہوں اور خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف الخیال ہوں مقصد میں وہ سب ایک ہیں۔ زندگی اور کائنات اور اس میں آدمی کے رشتے کو جوڑنے میں سب ہی اپنی اپنی جگہ درست اور اضافی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس طرح انسانی کمیت کا اس کی ماہیت اور رنگ و روپ سے گہرا تعلق ہے اسی طرح ایک مخصوص فلسفہ ایک مخصوص سماجی ماحول ہی کی پیداوار ہو سکتا ہے اور اس اعتبار سے ایک مخصوص ماحول کے لوگوں کے لئے اس متحرک فضا سے مطابقت رکھنے والا اور اس فضا کی بقا کے لئے جواز پیش کرنے والا ہی فلسفہ درست اور قابل قبول ہوگا۔ مگر انسانی سماجی کمیت چوں کہ بدلتی رہتی ہے اس لئے اصولاً فلسفہ کو بھی بدلنا چاہئے تاکہ وہ نئے حالات کا جائزہ لے اور نئی زندگی کے لئے بھی اپنی خدمات پیش کرتا رہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا نہیں بھی ہوتا ہے۔ دوسرے ذہنی مظاہرے کی طرح فلسفہ بھی جہاں مستقبل کی پیدائش میں مدد دینے والا عنصر ہے وہیں وہ ماضی کے احیا پر بھی مصر ہوتا ہے اور جہاں اس کا اصرار داخلی ہو کر رہ جاتا ہے وہاں سماج میں نظریاتی انجماد اور اس کو توڑنے کی ضرورت کا تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اقبال کے فلسفہ خودی کو لیجئے۔ کچھ عرصہ پہلے اس کا کافی چرچا تھا۔ بلکہ اقبال کو نئے زمانے کا پیغامبر اور عظیم فلسفی کہا گیا ہے۔ آج نسبتاً فلسفہ خودی کے چرچے کم ہیں۔ مگر کیا کوئی فلسفہ اس طرح اچانک معدوم ہو سکتا ہے؟ کیا فلسفہ کا تعلق فلسفی کی زندگی اور ذات سے ہی وابستہ ہوتا ہے یا وہ آنے والے زمانے پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کی طرف دانش وروں کو توجہ دینی چاہئے۔

قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا تقاضہ ہے کہ ہم دو مختلف فلسفوں میں مشترک باتیں بھی تلاش کریں۔ اقبال کے فلسفہ خودی میں آج تک مولانا روم، نیتشے، فشٹے، شوپنہاور، برگساں، محی الدین عربی، عبدالکریم جیلی کے اثرات ہی کو ڈھونڈا گیا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ فلسفہ خودی کی اولین اور موثر ترین بنیادیں اُپنیشد کی تعلیمات ہی میں ملتی ہیں۔ اس طرح اقبال کا فلسفہ خودی بنیادی طور پر صحیح فلسفوں میں اُپنیشد کے انقلابی تصورات ہی سے فیضان پاتا ہے۔ علامہ اقبال چوں کہ فلسفہ کو ہندو تصوریت سے چھٹکارا دلانا چاہتے تھے اس لئے غالباً انھوں نے شعوری طور پر یہ کوشش کی کہ اس فیضان کا ذکر نہ کیا جائے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے اپنے مقالہ "رومی، نیتشے اور اقبال" میں اقبال سے شکایت کی ہے کہ "انھوں نے بلاوجہ اسرار خودی کے تصورات کو امام شافعی سے جوڑ دیا ہے۔ حالانکہ امام شافعی کے قول کے تحت میں کوئی ایسا فلسفہ نہیں تھا بلکہ اقبال کی ان نظموں میں برگساں کا رنگ جھلکتا ہے مگر اسرار خودی میں برگساں کا نام نہیں لیا گیا۔" اقبال چونکہ نیتشے کے تصور قوت سے بہت متاثر تھے اس لئے ممکن ہے انھوں نے ویدانت کو اپنے مخصوص انداز میں "بے عملی" اور "محکومیت پسندی" کا "گوسفندی" فلسفہ تصور کیا ہو۔ پھر بھی یہ ایک واقعہ ہے کہ اصطلاحات سے قطع نظر اُپنیشد کے تصورات ہی سے خودی کے حسین اور ہمہ گیر تصورات کا خمیر اٹھا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر قاضی عبدالحمید اپنے مقالہ "اقبال کی شخصیت اور اس کا پیغام" میں فرماتے ہیں کہ "اقبال شنکراچاریہ کے فلسفہ (ویدانت) سے بہت دل دادہ تھے۔"

اقبال جس زمانے میں پیدا ہوئے وہ سائنس اور فلسفہ کی ترقی کا ایک انقلابی دور تھا۔ ان سے بہت پہلے ۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی عیسوی میں نیچرل سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے مادی فلسفیانہ خیال کو کافی بلند کر دیا تھا۔ فرانسس بیکن نے تجربیت کو علم کی بنیاد قرار دیا تھا۔ اسی زمانے میں مادہ اور حرکت کے تصور نے مادی فلسفے کی بنیادیں مضبوط کیں۔ ڈکارٹس نے فطرت کے مادی تصور کی بیش بہا خدمت انجام دیں۔ تھامس ہابس نے "نظریۂ انسان" پیش کر کے علم میں کافی اضافہ کیا۔ نیوٹن نے حرکت کا نظریہ پیش کر کے ایک انقلاب پیدا کیا۔ پھر انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں جرمن فلسفی لڈوگ فیورباخ اور خاص کر روسی انقلابی جمہوریت پسند الیگزینڈر ہرزن، بیلنسکی، نکولائے چرنیشفسکی اور دوبرولیوبوف، اور بعد کو جرمن فلسفی مارکس اور اینگلس اور انگریز سائنس داں چارلس ڈارون وغیرہ نے انسانی علوم کے خزانوں میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ مگر تعجب ہے کہ ایسے زمانے میں اقبال نے عینیت کا سہارا لیا۔ اور مادیت سے اس کا رشتہ اس طرح جوڑ دیا کہ نہ اس میں اُپنیشد ہی کی ہمہ گیری، وسعت، بلندی اور حسن باقی رہا اور نہ ترقی یافتہ مادی فلسفہ کی انقلابیت ہی کا رنگ ابھر سکا۔

یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ اقبال عینیت کے پیرو بھی دور دراز کے لوگوں سے فیضان لینا زیادہ پسند کرتے ہیں جب کہ خود اقبال کو متاثر کرنے والوں نے ہندوستان ہی کے فلسفے سے روشنی حاصل کی تھی کیوں کہ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں عباسی خلیفہ ہارون رشید

اور مامون رشید کے زمانے میں ہندوستان سے فلکیات، ریاضیات، جغرافیہ، فلسفہ، اور طب وغیرہ کی بیش بہا سنسکرت کتابیں بغداد لے جائی گئی تھیں۔ اور خلیفہ المنصور (وسط آٹھویں صدی) کے زمانے میں ہندوستانی، یونانی، شامی اور لاطینی زبانوں کی کتابوں کے ترجمے اور تحقیق کے لئے ایک ادارہ قائم ہو گیا تھا۔ محی الدین عربی نے قرآن مجید کی تفسیر میں وحدت الوجود کے تصور کو گیتا کی تعلیمات کی مماثلت میں پیش کیا تھا اور یہی بات جرمن فلسفی شوپنہار پر بھی صادق آتی ہے۔ بہرحال ہندوستان کے اس پس منظر کو اقبال نے بالکل نظر انداز کر دیا اگرچہ ہندوستان میں آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے عینی اور مادی فلسفہ نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ عام لوگ ان پر مباحثے کرتے تھے اور اپنی روزمرہ زندگی سے اس کا رشتہ جوڑتے تھے۔

ہندو فلسفہ کا بنیادی خیال کرم کا قانون ہے۔ اعمال خواہ اچھے ہوں یا برے زندگی میں اپنے نتائج کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور یہ نتائج اسی وقت ظاہر ہوتے ہیں جب مخصوص عمل مخصوص پھل کی تمنا میں پورا ہوا ہو۔ کرم کے اس اصول سے چھٹکارا پانے کے لئے عمل کرتے ہوئے بھی بے عمل ہونے کا راز بتایا گیا ہے۔ یعنی عمل میں بے غرضی شریک کرنے سے اس کی طاقت بے پناہ ہو جاتی ہے۔ کرم (عمل) سے جب تک وکرم (بے عمل) نہیں ملتا اس وقت تک کرم مردہ رہتا ہے۔ کرم کو بارود سے تشبیہ دی گئی ہے اور وکرم کو آگ سے۔ کرم اگر لکڑی ہے تو وکرم آگ جو پل بھر میں لکڑی کو راکھ میں بدل دیتا ہے۔ زندگی کو کامران بنانے کے لئے گیتا نے اس زریں راز کو اس اشلوک میں پیش کیا ہے:

कर्मण्यकर्म यः पश्येदकर्मणि चकर्म यः ।
स बुद्धिमान्मनुष्येषु सयुक्तः कृत्स्नकर्मकृत् ॥

(جو شخص کرم میں اکرم اور اکرم میں کرم دیکھتا ہے وہ سب انسانوں میں گیانی اور وہی یوگی اور سب کرم کرنے والا ہے)

ہندوستانی مفکرین اس بات پر بھی متفق ہیں کہ حقیقت سے ناواقفیت اور خودی کو جسم کی لذت کا شکار بنانے سے ساری مصیبتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان سے چھٹکارا پانے کے لئے خودی کو جسم کی غلامی سے آزاد کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسی نجات سے انسان بار بار کے جنم اور مصیبتوں سے چھٹکارا پا سکتا ہے۔ وغیرہ

شنکر اچاریہ کے ویدانت کے تصور کے مطابق خودی اور خدا دو علیحدہ حقیقتیں نہیں ہیں۔ رگ وید سے بھی ان تصورات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اُپنشد میں خدا اور خودی کے بارے میں جتنی واضح تصویر ملتی ہے ویدوں میں کہیں نہیں ملتی۔ مشہور جرمن فلسفی شوپنہار نے اُپنشد سے متاثر ہو کر کہا ہے کہ "ساری دنیا میں اُپنشد سے زیادہ مفید اور بلندی عطا کرنے والا علم کوئی نہیں ہے۔ یہی میری زندگی یہی میری موت کا سکون ہے۔"

اُپنشد انسان کی توجہ کو ویدک خداؤں سے ہٹا کر انسان کی خودی کی طرف منعطف کرتے ہیں وہ خودی کو ابدی اور جسم، احساسات ذہن اور خواہشات کو عارضی اور بدلنے والے بتاتے ہیں۔ اس تصور کے مطابق حقیقی خودی ایک مکمل شعور ہے جسے آتما بھی کہا جا سکتا ہے

یہ انسانی خودی جو غیر محدود اور باشعور حقیقت ہے۔ سارے انسانوں کی خودی ہے، اس لئے خدا یا برہما سے مشابہ ہے۔ اس لئے اسی خودی کی پہچان میں عظیم ترین علم پوشیدہ ہے اور ظاہر ہے دوسرا سارا علم کمتر درجے کا ہے۔ خودی کے حصول کے لئے ضبط نفس اور تعلیم کی ضرورت ہے تاکہ ماضی کی طاقتیں اور عادتیں محکوم کی جا سکیں۔ اُپنشد بیجا رسوم کو بے اثر قرار دیتے ہیں۔

اُپنشد کی تعلیمات کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ یہ فلسفہ کثرت میں وحدت دیکھتا ہے جس طرح سونے سے بنائی گئی کئی اشیا مختلف نظر آنے کے باوجود حقیقت میں ایک ہی شے ہیں اور جس طرح ایک شیشے میں محدود کی گئی خلا اور شیشے کی باہر کی خلا ایک ہی حقیقت کے مختلف تعینات ہیں اسی طرح کائنات کی ساری اشیاء میں ایک ہی حقیقت جاری و ساری ہے۔ اپنشد کے اسی وحدت الوجود کے تصور کو غالب نے یوں پیش کیا ہے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اُپنشد انفرادی خودی کے حصول اور مطلق خودی (خدا) سے یگانگت حاصل کرنے کو ساری جد و جہد کی آخری منزل قرار دیتے ہیں۔ ان تصورات کا ایک اور انقلابی پہلو جسے ہندو اور بودھی مفکر سب مانتے ہیں یہ ہے کہ جسم کی کوتاہیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جد و جہد اور فتح میں وجود کے لئے انسانی پیدائش بلند ترین مقام ہے۔ چنانچہ دیوتاؤں کو بھی اپنی خودی کے حصول کے لئے انسان بن کر پیدا ہونا پڑتا ہے۔

علامہ اقبال نے بھی فلسفہ خودی میں قریب قریب یہی خیالات پیش کئے ہیں۔ اپنشد میں جس طرح انفرادی خودی کے مطلق خودی سے جڑ جانے کو آخری منزل کہا گیا ہے اور اس کے لئے خودی کا حصول ضروری ہے اسی طرح اقبال کے ہاں آخری منزل "انسان کامل" بنتا ہے۔ اور خودی کا حصول اس کا ذریعہ ہے۔ جس طرح اپنشد میں انفرادی خودی کو مادی جسم و ماحول سے کشمکش کر کے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے اسی طرح اقبال کے ہاں خودی تک پہنچنے کا ذریعہ یہ ہے کہ زمان مسلسل سے پیچھا چھڑایا جائے۔ دوسرے معنوں میں انسان "غیر خود" سے یعنی اپنے طبعی ماحول سے مسلسل جنگ کرتا رہے۔

جہاں تک خودی کی میکانکیت کا تعلق ہے اقبال کا تصور خودی اپنشد کے تصور خودی کے مطابق ہے۔ مگر خودی کی منزل کا جہاں تک تعلق ہے ان میں بڑا فرق ہے۔ اپنشد میں انفرادی خودی کی آزادی سے پہلے وجود کو انسانی وجود سے ہو گذرنے کی ضرورت ہے اور اس کی آخری منزل خدا میں مل جانا ہے۔ اس کے برخلاف اقبال کی خودی کی منزل "انسان کامل" بنتا ہے۔ جو لازوال اور غیر محدود حقیقت نہیں ہے۔ کیونکہ اسلامی عقائد کی بنا پر انسان کامل خدا تو کیا خود پیغمبر اسلام کے درجے کو پہنچنے کا گمان تک نہیں کر سکتا۔ اس طرح اقبال کے مرد کامل کے آگے مزید دو اور اعلیٰ منزلیں باقی رہ جاتی ہیں جو پیغمبر صلعم اور خدا کی ذات ہیں۔ اس کے برخلاف اُپنشد کا انفرادی وجود نہ صرف انسان بن سکتا ہے بلکہ خودی کو حاصل کر کے کائنات کی منتہائی حقیقت

یعنی خدا کے برابر درجہ حاصل کر سکتا ہے۔

یہ اقبال کے فلسفہ کے تضاد ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کے ہاں خودی کی اٹھان جیسی جوشیلی ہے اس کے لئے منزل ویسی ہی بلند، لازوال اور غیر محدود نہیں ہے۔ کردار اور شخصیت کا یہی تضاد ان کے مرد کامل کو ادھورا رکھتا ہے۔ اور جب ہم ان کے فلسفہ کو سمجھنا چاہتے ہیں تو جگہ جگہ مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ جہاں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی وہ ہئیت اجتماعیہ کی بنیاد عقلی قوانین پر رکھتے ہیں تو کبھی وہ حقیقت کے پتہ چلانے کے لئے وجدان کو ہی بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں۔

قومی یک جہتی پر سیمینار

نئی دہلی میں یکم اپریل کو قومی یک جہتی کے سلسلے میں مصنفین کا ایک روزہ سیمینار منعقد ہوا سیمینار میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ایک مشترکہ قومی مقصد کی کمی ملک میں انتشار پسند رجحانات کا خاص سبب ہے۔

مصنفین نے کہا کہ آزادی کی لڑائی کے دوران ایک ایسا مقصد لوگوں کے سامنے تھا اور اب ایک حوصلہ بخش منزل کی شکل میں اس طرح کا مقصد عوام کے سامنے رکھنا چاہئے۔

سیمینار ساہتیہ اکاڈمی کے زیر اہتمام ہوا اور اس کا افتتاح کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ نے مصنفین سے صحیح تصورات، وسعت فکر اور مناسب احساسات پیدا کرنے کی اپیل کی۔

مرکزی وزیر ثقافت مسٹر ہمایوں کبیر نے مباحثہ کو ختم کرتے ہوئے کہا کہ ایک مصنف کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ لوگوں میں انسانیت کا جز ہونے کا احساس پیدا کرا لے۔

مباحثہ میں سب سے پہلے تقریر کرتے ہوئے ہندی کے مصنف مسٹر رام دھاری سنگھ دنکر نے بعض ایسے عناصر کا ذکر کیا جن سے ان کی رائے میں یک جہتی کو نقصان پہنچتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مصنفین مذہب اور زبان کے پیدا کئے ہوئے اختلافات کو کم کرنے میں مدد دے سکتے ہیں اور انسان کے دماغ میں نئے خیالات پیدا کر سکتے ہیں۔

مورخ اور مصنف ڈاکٹر کے ایم پنیکر نے کہا کہ مصنف بنیادی طور پر الگ تھلگ رہتا ہے سماج کو بدلنے کی اس پر کوئی براہ راست ذمہ داری نہیں ہوتی اگر ان سے بعض باتوں کی پابندی کرائی گئی تو اس سے جبر یک رنگی پیدا ہوگی۔

انھوں نے یک جہتی کے لفظ پر اتحاد کے لفظ کو ترجیح دی اور کہا کہ کوشش صرف اس بات کی ہونی چاہئے کہ لوگوں کی الگ الگ تہذیب کو برقرار رکھتے ہوئے ملک میں اتحاد پیدا کیا جائے۔

خواجہ غلام السیدین نے کہا کہ یک جہتی انسانیت کی ایک بنیادی خصوصیت ہے اسے خطرہ اعلیٰ درجے کی تخلیقی تصنیفات سے نہیں بلکہ دوسرے درجے کی ان تحریروں سے ہے جو سنسنی پسند اخبارات میں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ عوام میں پڑھنے کا شوق پیدا کیا جائے اور مصنفین کے باہمی تبادلہ خیال کے لئے ادارے قائم کئے جائیں۔

اردو کے مصنف سید سجاد ظہیر نے کہا کہ آج کی تحریروں میں عوام کے نئے حوصلے منعکس ہونے چاہئیں اور مصنفین کو نا مذہبی جمہوریت اور سوشلزم کے اصولوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

بنگالی مصنف مسٹر تارا شنکر بنرجی نے کہا کہ سماج کی ضرورت سے زیادہ تنسیم سے مصنف بھی متاثر ہوتا ہے اس لئے کہ اس طرح اس کے دماغ میں بعض رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں مصنف کو سماج کے مشترک رشتوں کی تلاش اور ان کے استحکام کی کوشش کرنی چاہئے۔

مباحثہ میں بہت سے دوسرے مصنفین نے بھی حصہ لیا جن میں مسٹر ویریندر کمار جین، آچاریہ مسٹر جوالا، مسٹر ...، مسٹر ماشکر چودھری، مسٹر ... ، مسٹر ... ، مسٹر ... ، مسٹر نرش پانڈے، اور مسٹر پانڈے شامل تھے۔

آندھرا میں اردو زبان کی منصفانہ سرپرستی کا خیر مقدم

حیدرآباد ۱۰ مارچ۔ مولانا حافظ ابو یوسف نے کونسل میں بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے چیف منسٹر شری سنجیوا ریڈی کی خدمات کو پر زور الفاظ میں سراہا کہ انھوں نے اردو زبان کو ریاست کی دوسری زبان کا درجہ دیا۔ وزیر مالیات بھی قابل مبارک باد ہیں۔ ان کی تقریر سوا ذرا اردو میں تقسیم کی گئی چیف منسٹر بھی اہل اردو کے خراج تحسین کے مستحق ہیں جنھوں نے اردو کی ترقی میں ہمیشہ دل چسپی لی۔ دلی اور یوپی میں اردو والوں کو اس زبان کا حق تسلیم کرانے میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور زبان اردو کو ابھی علاقائی زبان کا درجہ حاصل نہ ہو سکا ہندوستان کی تمام ریاستوں میں آندھرا پردیش سب سے پہلی ریاست ہے جس نے اردو کو علاقائی زبان کی آئینی حیثیت دے دی ہے۔

تلوک چند محروم کے اعزاز میں جشن

نئی دہلی۔ بزم سخن موتی باغ کی طرف سے جناب تلوک چند محروم کی اعزاز یابی کی خوشی میں ۲۰ مارچ کو جشن محروم منایا گیا جناب مہر چند کھنہ وزیر حکومت ہند نے صدارت فرمائی۔ محروم صاحب کی نظم "ہمارا دیش" سے تقریب کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد بزم سخن اور گورنمنٹ ایمپلائز ایسوسی ایشن کی طرف سے آپ کو سپاس نامے پیش کئے گئے۔

تقریب کے صدر شری مہر چند کھنہ نے محروم صاحب کو خوش آمدید کہا اور اپنی طرف سے مبارک باد پیش کی۔ آپ نے فرمایا مجھے یہ سن کر از حد خوشی ہوئی ہے کہ حکومت پنجاب نے آپ کی عزت افزائی کی ہے محروم صاحب نے اردو ادب کی اور وطن کی بڑی خدمت انجام دی ہے جس پر ہندوستان بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

اس کے بعد بزم سخن کے سکریٹری مسٹر ... ابو الوہری نے موصول شدہ پیغامات حاضرین کو پڑھ کر سنائے جن میں پنڈت جواہر لال نہرو، سردار گرمکھ نہال سنگھ، ڈاکٹر ذاکر حسین، لالہ بھیم سین سچر اور سردار سورن سنگھ کے پیغام بھی شامل تھے۔

آخر میں ایک مختصر سی بزم مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں مقامی شعرا نے اپنا کلام سنایا۔

چیف جسٹس مسٹر سنہا "ایوانِ اردو" میں

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی طرف سے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب بی پی سنہا کا "ایوان اردو" میں پر تپاک خیر مقدم کیا گیا۔ صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر نے ادارہ کی جانب سے مسٹر سنہا کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جسٹس سنہا ممتاز ترین ماہر قانون کے ساتھ فرقہ وارانہ یک جہتی اور قومی ہم آہنگی کے ایسے علم بردار بھی ہیں۔ چیف جسٹس نے جوابی تقریر میں اردو ادب کو خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے شعر و ادب سے اپنی دیرینہ وابستگی کا ذکر کیا۔

نامہ نگار

ایک لاکھ روپے کا ادبی انعام

بھارتیہ گیان پیٹھ نے اعلان کیا ہے کہ دستور ہند کی تسلیم کردہ زبانوں میں جو کتابیں لکھی جائیں گی ان میں سے ایک بہترین کتاب کو ہر سال ایک لاکھ روپے کا انعام دیا جائے گا۔ گیان پیٹھ ایک ثقافتی و تحقیقی ادارہ ہے جس کا دفتر کلکتہ میں ہے۔ سنسکرت، پراکرت، تامل اور دوسری زبانوں کی قدیم کتابوں کو شائع کرنے کے لیے ۱۹۴۴ء میں شانتی پرشاد جین نے یہ ادارہ قایم کیا تھا۔ جدید ہندوستانی ادب کی ہمت افزائی کے لیے گیان پیٹھ نے اب اس نئے انعام کا اعلان کیا ہے

اس انعام کے سلسلے میں ابتدائی تنظیمی کارروائیاں عمل میں آ رہی ہیں۔ گیان پیٹھ کی صدر شریمتی راما جین ہیں۔

علاقائی زبانوں کے اداروں کو قومی ادارہ قرار دیا جائے

راجیہ سبھا میں الہ آباد کے ہندی ساہتیہ سمیلن کو قومی اہمیت کا ادارہ قرار دینے کے بل پر غیر مختتم مباحثہ ہوا۔ بل پیش کرتے ہوئے مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر کے ایل شری مالی نے کہا کہ اس ادارے نے جس کا قیام ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا قومی زبان کی حیثیت سے ہندی کی بیش بہا خدمت کی ہے لیکن ادھر چند برسوں کے اندر مخالف گروہوں نے پورے ادارے کو معطل کر دیا ہے جب کہ حکومت اس کو قومی ادارہ قرار دے کر اس کو ہندی زبان کی ترقی کا موثر ذریعہ بنانا چاہتی ہے۔

مغربی بنگال کے کمیونسٹ ممبر مسٹر بھوپیش گپتا نے اپنی تقریر میں مطالبہ کیا کہ ہندی ساہتیہ سمیلن کو قومی ادارہ قرار دینے کے ساتھ ساتھ دوسرے علاقوں میں وہاں کی علاقائی زبانوں کے اسی طرح کے اداروں کو بھی قومی اداروں کی حیثیت دی جائے تاکہ علاقائی زبانوں کو بھی ترقی کرنے کا پورا موقع ملے۔

مسٹر داہیا نے ہندی کے لیے رومن رسم الخط قبول کر لینے کی ضرورت پر زور دیا۔

کرخنداری اردو کا لسانیاتی مطالعہ

(انگریزی)

زبان کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بولیوں کی اہمیت تسلیم کی جائے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جامع مسجد دہلی اور گرد و نواح کے علاقے میں بولی جانے والی "کرخنداری اردو" کا لسانیاتی تجزیہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ڈھائی سو برس پہلے کی قدیم اردو کے بعض عناصر اب بھی اس میں محفوظ و مستعمل ہیں۔ مقدمہ میں زبان اور بولی کے باہمی رشتے اور زبان کے نئے تقاضوں سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ساڑھے سات روپے

منشی رام منوہر لال اورینٹل اینڈ فارن بک سیلرز
نئی سڑک۔ دہلی ۶

انجمن کی نئی مطبوعات

گاندھی اور نہرو کی راہ	ڈاکٹر سید عابد حسین	۵/۰۰
فن تحریر کی تاریخ	محمد اسحاق صدیقی	۷/۵۰
ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول	ڈاکٹر ایشور ٹوپا	۲/۲۵
کچھ ذرے کچھ تارے (مجموعہ کلام)	آنند نرائن ملا	۲/۵۰
حالی کی ایک جھلک	بیگم صالحہ عابد حسین	۱/۵۰
اردو غزل (جدید ایڈیشن)	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۹/۰۰
الایام	ڈاکٹر طٰہٰ حسین	۴/۰۰
سخن مختصر (نیا مجموعہ کلام)	جذبی	۲/۰۰
تاریخ جمالیات	مجنوں گورکھپوری	۲/۰۰
انجم کدہ	عزیز لکھنوی	۲/۵۰
غزل اور درس غزل	اختر انصاری	۴/۰۰
نئے ڈرامے	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	۵/۰۰
دیپک کی کہانی	ڈاکٹر عبد البصیر خاں	۲/۰۰
گل کرسٹ اور اس کا عہد	عتیق صدیقی	۴/۰۰
غالب	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۶/۰۰
شاد کی کہانی شاد کی زبانی	محمد مسلم	۵/۰۰
بھگوت گیتا	محمد اجمل خاں	۲/۵۰
نئی روشنی	محمد فضل الرحمٰن	۱/۵۰

انجمن کی چند اور مطبوعات

سیاسیات کے اصول (مکمل)	ہارون خاں شروانی	۵/۰۰
دھمپد	منور لکھنوی (مترجم)	۳/۰۰
ہندی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محمد حسن	۵/۵۰
قومی تہذیب کا مسئلہ	ڈاکٹر سید عابد حسین	۴/۰۰
ہندوستانی سماجیات	ڈاکٹر جعفر حسین	۳/۵۰
ادبی قومی تذکرے (اول)	کشن پرشاد کول	۴/۵۰
" (دوم)	"	۳/۵۰
اسلامی فن تعمیر	ممتاز الدین رفعت	۶/۰۰
کچھ زندگی بابت (مجلد)	ابو سالم	۲/۵۰

شعراء کے انتخابات

(ہر انتخاب کی قیمت ۵۰ نئے پیسے)

شفیق جونپوری۔ نسیم کرہانی۔ جوہر نظامی۔ جذبی۔ مخدوم۔ سکندر علی وجد۔ جگر بریلوی۔ حبیب احمد صدیقی۔ فیض۔ تاباں۔ شاد عارفی۔ مجاز۔ فراق گورکھپوری۔ اثر لکھنوی۔ اختر انصاری۔ جاں نثار اختر۔ یگانہ چنگیزی۔ آنند نرائن ملا

ناشر

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

مراسلات

مضطر خیرآبادی

ہماری زبان ۲۲ مارچ ۶۲ء میں جناب خاور جبل پوری نے میرے والد مضطر خیرآبادی کے بارے میں جو استفسار کیا ہے اس کا مختصراً جواب لکھ رہا ہوں۔ ان کا مولد خیرآباد ضلع سیتاپور اودھ اور سنہ پیدائش ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۴ء ہے۔ سنہ وفات ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء ہے۔ شاعری میں حضرت امیر مینائی مرحوم سے تلمذ حاصل تھا۔ ملازمت کی ابتدا ریاست ٹونک سے ہوئی۔ جہاں مضطر کے بزرگ آغاز ریاست سے ممتاز عہدوں پر مامور چلے آتے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں آپ ٹونک کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر گوالیار چلے آئے اور تقریباً بیس سال تک یہاں مختلف خدمات پر فائز رہے۔ آخر میں یکم دسمبر ۱۹۲۳ء کو سٹی مجسٹریٹ درجہ اول کے عہدے سے مستعفی ہو کر بھوپال چلے گئے۔ یہاں ان کا تقرر نواب نصر اللہ خاں ولی عہد بھوپال کی ڈیوڑھی میں جوڈیشل سکریٹری کے عہدہ پر ہو گیا لیکن دس مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ نواب موصوف کا انتقال ہو گیا اور مضطر بھوپال کو خیرباد کہہ کر اندور جا پہنچے۔ ۲۷ ستمبر ۲۴ء سے مضطر مہاراجہ اندور کے مصاحبین میں شامل ہو گئے اور تا دم مرگ ریاست اندور ہی کے ملازم رہے۔ انتقال گوالیار میں ہوا جہاں قلعہ پر درگاہ چھنگا شاہ بابا میں مدفون ہیں۔

مضطر کا حمدیہ دیوان نذر خدا ۱۹۱۳ء میں مطبع صوفی آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ ان کا نعتیہ دیوان نیاز مصطفیٰ جو ان کے ایک شاگرد کی معرفت آگرہ پریس میں طبع ہونے کے لئے گیا تھا مع رقم انہی کی نذر ہو گیا۔ چند نظمیں کتابی شکل میں شائع ہوئی تھیں:

(۱) منہ دیکھی محبت (۱۹۰۴) (۲) نیکی کا بدلا بدی (۱۹۰۴)

(۳) اللہ بس باقی ہوس (۱۹۰۴)۔

خان مضطر کے نام سے ایک عاشقانہ مثنوی بھی کہی تھی لیکن اب لاپتہ ہے۔ چند اور نظمیں بھی کتابی شکل میں شائع ہوئیں لیکن ان کی حیثیت مختلف ہے جن میں شورِ ماتم، نالۂ درد، "مقدمۂ گلستان آرزو" وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ نثری تصانیف میں صرف ایک ناول "قتیل جفا" کے نام سے شائع ہوا تھا جو ان کے عنفوانِ شباب کی تصنیف ہے اور جو ایک زمانے سے نایاب ہے۔ ان کے عاشقانہ کلام کا مجموعہ میں نے ۱۹۴۷ء میں مرتب کیا تھا بارہ سال سے زیادہ مولوی عبدالحق صاحب کے قبضے میں رہا۔ بہرکیف بڑی کوشش کے بعد میں اسے دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ جلد ہی نظرِ ثانی کے بعد اشاعت کا خیال ہے۔

جاں نثار اختر

کان پکڑی چھیری

جناب خاور صاحب جبل پوری نے ۱۵ فروری ۱۹۶۲ء کے اخبار ہماری زبان کے صفحہ ۶ پر "کان پکڑی چھیری" میں مسکین طبع آدمی کو سیدھی سادی بکری سے مناسبت دیا جانا ظاہر کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ یہ محاورہ اصل میں "کن پکڑی چھیری" ہے جو بمعنی مطیع و فرمانبردار استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ بکری کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ جب اس کا کان پکڑ لیا جائے تو مطیع و فرمانبردار ہو جاتی ہے۔ جدھر کان پکڑنے والا لے جانا چاہتا ہے ادھر ہی گردن جھکائے چلی جاتی ہے۔

کن ٹوپ، کن کٹا، کن سرا، کن چھیدن اور کن رس وغیرہ ہندی الفاظ کی طرح اس محاورے میں بھی "کان" کی صورتِ مخفف "کن" مستعمل ہوئی ہے۔ اگر اس کو بدل کر "کان" کر لیا جائے اور "چھیری" کو "چھیری" رہنے دیا جائے۔ جیسا کہ خاور صاحب نے کہا ہے تو محاورہ آدھا تیتر آدھا بٹیر کے مصداق اور غلط ہو جاوے گا۔

"لونڈی" یا "باندی" سے کان پکڑنے کا کوئی تعلق نہیں اور نہ علاوہ ایسا کوئی دستور کہ جس کی بنا پر یہ محاورہ بول چال میں آگیا ہو۔ ان لفظوں کے ساتھ "زر خرید" "خانہ زاد" وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے جو لونڈی اور باندی سے بین مناسبت رکھتے ہیں۔ آواز کی جہت سے "چھیری" (بکری) کو مزاحاً "میں میں" بھی کہتے ہیں۔ پس معلوم ایسا ہوتا ہے کہ "کن" کو "کان" اور "چھیری" کو "میں میں" سے بدل کر محاورے کو "کان پکڑی میں میں" بنا لیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ "کن پکڑی چھیری" اور "کان پکڑی میں میں" ہی سے واضع کا مقصدِ اصلی پورا ہوتا ہے اور یہی دونوں محاورے کی تعریف میں آتے اور قرینِ صحت قرار پاتے ہیں۔

سراج دھول پوری

تصحیح

۱۵ مارچ کے "ہماری زبان" میں صفحہ ۷ کالم ۲ نمبر (۴) پر جو نقش بند خاں کی تاریخ وفات مولانا حالی کی قرآن شریف سے نکالی ہوئی درج ہے وہ غلط نقل ہوئی ہے۔ درج شدہ الفاظ یہ ہیں ـــ وحلوہن اساور من فضۃ

غلطی یہ ہے کہ پہلا (من) نہ ہونا چاہئے۔ اور (حلو) میں واؤ کے بعد الف لکھنا ضروری ہے۔

قرآن مجید سورہ دہر کے الفاظ یہ ہیں: ـ وَحُلُّوٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ـــ اور اسی سے سال انتقال (۱۳۲۹ھ) برآمد ہوتا ہے۔

حامد حسن قادری کراچی

تبصرے

محمد عتیق صدیقی

گورودیو ٹیگور

مصنف: دیپک بھٹاچاریہ (مترجم شہباز حسین)

تقطیع: ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۳۲ صفحات، قیمت چار روپے

ملنے کا پتہ: پیشرو پوشین بک کمپنی، نیتاجی سوبھاش مارگ۔ دہلی ۶

یہ کتاب دیپک بھٹاچاریہ کے ان چودہ مضامین کا مجموعہ ہے جو ملک کے مختلف انگریزی اخبار و رسائل میں شایع ہوئے تھے اور جن میں ٹیگور کی زندگی اور فن کے مختلف گوشوں کا دلچسپ انداز سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہی مضامین اب انگریزی، اردو اور ہندی میں کتابی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے "تعارف" سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ اردو ایڈیشن کا پیش لفظ عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل نے لکھا ہے۔

ٹیگور کے بیشتر افسانے، ناول، ڈرامے اور گیت اردو میں منتقل ہو چکے ہیں۔ لیکن ٹیگور کی حیات اور فن پر اردو میں اب تک کوئی جامع کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ شری بھٹاچاریہ کی یہ کتاب بڑی حد تک اس خلا کو پر کرتی ہے۔

ید بیضا

ساحر بھوپالی

تقطیع: ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۰۰ صفحات۔ قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ جامع مسجد دہلی ۶

ید بیضا ساحر بھوپالی کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے پہلے "سحر حلال" اور "صدائے دل" کے نام سے ان کے دو مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ "ید بیضا کی خصوصیت" بقول ساحر صاحب "یہ ہے کہ حضرت قبلہ نیاز فتح پوری مدظلہ کا تعارف بھی شامل ہے۔"

ساحر غزل گو شاعر ہیں، اور اپنی شاعری میں غزل کی قدیم روایات کو کامیابی کے ساتھ برتتے ہیں۔ اس حقیقت کی طرف نیاز صاحب نے بھی اپنے مخصوص انداز میں اس طرح اشارہ کیا ہے

مرزا مظہر جان جاناں کا ایک شعر ہے ؎

نے فرصت اشکے نہ مرا رخصت آہے　　دارم بہ رخ دوست غریبانہ نگاہے

ساحر کی شاعری بھی اسی "غریبانہ نگاہے" کے رنگ کی ہے، اور اس کے اعتراف کی صورت یہی ہے کہ اگر اس کے ساتھ ہم اشک نہیں بہا سکتے تو کم از کم اس پر ہنسیں تو نہیں"۔ ان کے چند اشعار نمونتاً ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

ڈرتا ہے جہاں موت بھی جاتے ہوئے ساحر　　جینے کے لئے مجھ کو گذرنا ہے وہیں سے

جب کسی سے کوئی پیمان وفا کر نہ سکا　　یاد تجھ کو اپنے مٹنے کا زمانہ آ گیا

کہہ دی کو کہہ دیوں غبار نا امیدی نے　　کہ اب تو آرزو کی شکل پہچانی نہیں جاتی

کچھ اس سے پوچھئے روداد فرقت　　شب غم جس نے مر مر کے سحر کی

فسانۂ آزاد (جلد اوّل پہلی قسط)

تقطیع: ۲۲×۱۸/۱۶ حجم ۱۰۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ

راجہ رام کمار بک ڈپو۔ لکھنؤ

رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد جو چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے محتاج تعارف نہیں ہے۔ اس کا مکمل سٹ نایاب ہونے کی حد تک کمیاب ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ راجہ رام بک ڈپو (وارث نول کشور پریس) نے اس کو پاکٹ سیریز میں بالاقساط شایع کرنا شروع کیا ہے "کوشش کی گئی ہے کہ ہر قسط اپنی جگہ پر ایک مکمل کتاب معلوم ہو۔ اسے ہر شخص آسانی سے خرید سکتا ہے اور کم وقت میں پڑھ سکتا ہے۔ فی الحال دو قسطیں ماہوار شایع ہوں گی۔"

راجہ رام کمار بک ڈپو نے یہ مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ امید ہے کہ قدیم نول کشور پریس کی دوسری مفید کتابیں بھی اسی طرح دوبارہ شایع کی جا سکیں گی۔ کتابت و طباعت بری نہیں ہے لیکن اگر تھوڑی اور توجہ کی جائے تو اس سلسلے کو دیدہ زیب بھی بنایا جا سکتا ہے۔

ایم حبیب خاں

شاعر (جمہوریت نمبر)

اڈیٹر: اعجاز صدیقی

صفحات ۱۴۶　قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

مقام اشاعت: مکتبۂ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۵۳۶۶ بمبئی ۳

"شاعر" اردو کا ادبی رسالہ ہے۔ زیر نظر شمارہ جمہوریت سے متعلق قابل قدر مضامین کا مجموعہ ہے۔ "جمہوریت اور عوام"، "ہندی میں اردو"، "اردو ادب کا جمہوری کردار" اور "دستور ہند کے خاص نکات" خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ نظموں میں خوشحال، "ہماشے"، "دوزخ" اور "میں نے ہنسنا سیکھا" اچھی نظمیں ہیں۔ ڈراموں میں "سلطان ٹیپو" اور "سراج الدولہ" تاریخی ہیں جن میں ڈرامہ نگار نے انگریزی عیاری اور مطلب پرستی اور جعفر اور صادق کی غداری کا نقشہ اچھے انداز سے پیش کیا ہے۔ شاعر کا زیر نظر نمبر اچھا اور قابل تعریف ہے۔

ادب لطیف سالنامہ ۱۹۶۲ء

اڈیٹر میرزا ادیب

صفحات ۲۶۶　قیمت تین روپے

مقام اشاعت: ۸۸ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

"ادب لطیف" اردو کا علمی و ادبی رسالہ ہے۔ اس سالنامے میں بہت ادب کے اچھے لکھنے والوں کے مضامین ایک جگہ جمع کر دئیے گئے ہیں۔ اس کا سب سے اچھا حصہ تنقیدی ہے۔ اس میں مولوی عبد الحق مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ مقالہ اور "قلی قطب شاہ" سے جو سالنامہ کا پہلا مضمون ہے۔ اس کے علاوہ "تاریخ داغ" اور ظفر علی خاں کی شاعری پر بھی اچھے مضامین ہیں۔ یہ سالنامہ کئی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ لیکن مرزا ادیب کا کوئی ڈرامہ شامل نہ ہونا ادب لطیف کی روایات کے منافی ہے۔

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ظہیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شایع کیا